مغرب میں اسلام اور مسلمان

چیلنج اور امکانات

ڈاکٹر انیس احمد ○

مغرب کی علمی روایت میں ''اسلام اور مسلمان'' کا موضوع تہذیب و ثقافت کے حوالے سے' تصادم نہ سہی تو بھی' ثقافتی امتیاز' دوری اور علیحدگی کی فضا میں زیر بحث آتا ہے۔ اسی طرح مسلمان بھی عموماً مغرب کو اپنا ثقافتی مخالف اور اسلامی نظریہ حیات کے دشمن کی شکل میں دیکھتے ہیں جب کہ مغرب' اسلام کے وجود' بیداری اور احیا کو ایک ''آزادی اور جمہوریت کی مخالف قوت'' تصور کرتا ہے۔ مغرب کے اس لگے بندھے رویے کی جھلک ان افراد کے ساتھ اس کے مجموعی رویے میں دیکھنے میں آتی ہے جو اس کی سرزمین کے باشندے ہیں لیکن ان کا مذہب مختلف ہے۔ اس رویے کی ایک واضح شہادت عیسائی سربوں اور کروٹ کے ہاتھوں بوسنیا (اور اب کوسووا) کے مسلمانوں کی نسلی صفائی (ethnic cleansing) ہے۔ بوسنیا کے مسلمان ایک ہی زبان بولتے تھے' ایک ہی جیسے خدوخال اور شکل و صورت رکھتے تھے' لیکن وہ جرم جس کی قیمت انھیں اپنی جانوں سے چکانا پڑی سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ ان کی شناخت اسلام ہے۔ غالباً یہی وہ بنیادی سبب اور سوچ ہے جس کی وجہ سے یورپی یونین' ترکی کو اپنے کلب میں شامل کرنے پر تیار نہیں۔ ترکی کی قیادت نے معاشرے اور ریاست کی سطح پر اپنے آپ کو نفاذ اسلام سے الگ رکھا ہے مگر اس کے باوجود روایتی تعصب' نسلی امتیاز اور مسلمان ہونے کا خوف یورپی یونین کو انھیں قبول کرنے میں مانع ہے۔

مسلمانوں اور اسلام سے متعلق بڑے پیمانے پر پائی جانے والی بدگمانیاں اور معلومات کی کمی' اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جاری علمی و ثقافتی ''صلیبی جنگ'' نہیں ہے تب بھی اسلام اور مغرب کے درمیان

○ ڈائرکٹر جنرل' دعوہ اکیڈمی' اسلام آباد

رابطے کے پل تعمیر کرنے میں ایک بڑی رکاوٹ ضرور ہے۔ یہ بات بہت امید افزا ہے کہ حال ہی میں مغرب کے ہم عصر ماہرین اسلام نے مسلمان اہل علم سے مکالمے کا آغاز کیا ہے تاکہ دونوں برادریوں کے درمیان افہام و تفہیم کے پل تعمیر ہو سکیں (ملاحظہ فرمایئے "The Dialogue of Cultures and Civilizations" دی ڈپلومیٹ، جلد ۲، شمارہ ۴، فروری ۹۷)۔

جب قرآن نے ساتویں صدی میں یہ اعلان کیا تو دراصل یہ سنجیدہ مکالمے کی دعوت تھی:

"اے اہل کتاب! آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمھارے درمیان یکساں ہے۔ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا کسی کو اپنا رب نہ بنا لے" (ال عمرٰن ۳: ۶۴)۔

تاریخ کے بعد کے ادوار میں یہ مکالمہ ثقافتی، سیاسی، معاشی اور سماجی سطح پر جاری رہا۔ یہ اس وقت بھی جاری رہا جب مسلمان اور ان کے مغربی حریف مدمقابل تھے۔ اس کی ایک نمایاں مثال ۷۱۱ تا ۱۴۹۲، سات صدیوں سے زیادہ پر محیط اندلس میں مسلمانوں کا دور حکومت ہے۔

یورپ کے تاریک دور کی روایت کے برعکس، جو "علمی کلچر" مسلمانوں نے متعارف کروایا، پروان چڑھایا اور پھیلایا وہ عقل کی اہمیت، فکر کی آزادی اور علم کی فوقیت پر مبنی تھا۔ حتیٰ کہ سپین میں مسلمانوں کا سیاسی زوال بھی مقامی فن تعمیر، فنون لطیفہ (minor arts) اور سماجی رسوم و رواج میں مسلم ثقافت اور تہذیب و تمدن کے بقا اور تسلسل کو نہ روک سکا۔

جب ۲۹ مئی ۱۴۵۳ کو غازی محمد الفاتح نے قسطنطنیہ کو فتح کیا تو مسلمانوں اور یورپ کے درمیان قریبی تعلقات کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ گو مسلم آبادیوں کے آثار برطانیہ میں قرون وسطیٰ کی بادشاہت تک تلاش کیے گئے ہیں اور مورخین کے پاس شواہد موجود ہیں کہ غالباً ان میں سے کچھ بادشاہ مسلمان تھے۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ انگریزوں کے بحری بیڑے پر کام کرنے والے بہت سے ملاح صومالی اور یمنی مسلمان تھے۔

مسلمانوں کی نو آبادیاں اٹلی، فرانس، سوئٹزرلینڈ اور سسلی میں بھی موجود تھیں۔ تاریخی اعتبار سے ترک فوجی پروشیا [یورپی ریاست جو ۱۸۷۱ کے بعد یورپ کی جرمن سلطنت کی تشکیل میں ایک بڑی ریاست بن گئی] اور روس کی افواج میں ۱۷۴۵ تک لڑتے رہے۔ ایک مسلم رجمنٹ کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ ۱۷۷۸ کی بویریائی (Bavarian) [جرمنی کا ایک علاقہ] تخت نشینی کی لڑائی میں حصہ لے چکی ہے۔ ۱۸۰۷ میں نپولین کی فوج کو پروشیا میں مسلمان سپاہیوں کے ہاتھوں شکست سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ ۱۷۹۸ میں جب ترک سفیر کا برلن میں انتقال ہوا تو جرمن بادشاہ نے جرمنی میں پہلا مسلمان قبرستان تعمیر کرنے کے لیے جگہ فراہم کی۔

جنگ عظیم دوم کے بعد کا دور یورپ میں مسلمانوں کے وجود کے ایک نئے رخ کا تعین کرتا ہے۔ ترقی یافتہ یورپ سے ٹکنالوجی سیکھنے کی خواہش' اور دیگر سیاسی اور اقتصادی وجوہات کی بنا پر بہت سے مسلم نوجوان اعلیٰ تعلیم یا بہتر حالات کی خاطر وطن چھوڑ کر ادھر آئے۔ جلد ہی طلبہ اور پیشہ ور ماہرین نے مشرق وسطیٰ کے ممالک پاکستان' ملائیشیا اور کچھ افریقی ممالک سے برطانیہ' جرمنی' فرانس' اٹلی' سکنڈے نیوین ممالک اور دیگر ممالک کا رخ کیا۔ ایک بڑی تعداد میں افرادی قوت نے بھی یورپ کا رخ کیا' بالخصوص ترکی' شمالی افریقہ کے ممالک' بنگلہ دیش' پاکستان اور ویسٹ انڈیز سے۔

بہت سے نئے آزاد ہونے والے مسلم ممالک کی نو آبادیاتی دور کے بعد کی غیر مستحکم سیاسی اور اقتصادی صورت حال بھی مسلم نوجوانوں' پیشہ ور افراد اور دیگر افراد کے لیے مقابلتاً زیادہ جمہوری یورپی ممالک کی طرف رجحان کا ذریعہ بنی۔ سیاسی جدوجہد کے نتیجے میں آزادی حاصل کرنے والے اکثر مسلم ممالک میں پرانے آقاؤں سے نئے آقاؤں کی طرف اقتدار کی منتقلی نے بھی بہت سے ایسے نوجوانوں کی مایوسی میں اضافہ کیا جو کسی بہتر صورت حال کے لیے تبدیلی کی توقع کر رہے تھے۔ نئے حکمرانوں کی اکثریت اپنے مغربی طرز زندگی کی وجہ سے' ایسے مسلم مفکرین اور پیشہ ور افراد کے لیے دوست ثابت نہ ہوئی جو عالمی سطح پر معروف مفکرین مثلاً سیدابوالاعلیٰ مودودی (۱۹۰۳-۱۹۷۹)' حسن البنا (۱۹۰۵-۱۹۴۹) اور سید قطب (۱۹۰۳-۱۹۶۶) کی فکری اور انقلابی تحریروں سے متاثر تھے۔

ان پیشہ ور افراد' نوجوان رہنماؤں اور اشرافیہ نے اپنے آپ کو یونی ورسٹی کی سطح پر اور اسلامک ایسوسی ایشن' تنظیموں' سنٹروں اور تحریکوں کی صورت میں منظم کر لیا۔ ان میں سے اکثر نے یورپ اور امریکہ میں ہی قیام کرنے کا فیصلہ کر لیا اور مزید اسلامی سرگرمیوں کے لیے مرکز بن گئے۔

آج یورپ میں مسلمان نہ صرف مقامی آبادیوں پر مشتمل ہیں جیسے جرمنی' فرانس' اسپین' اٹلی اور سکنڈے نیوین ممالک میں' بلکہ تارکین وطن کی دوسری اور تیسری نسل کے افراد بھی حق شہریت کی بنا پر جن ممالک میں رہایش پذیر ہیں' ان کی آبادی کا حصہ بن چکے ہیں۔

یورپ میں مسلمانوں کی مقامی آبادیوں کو' غالباً دوسروں کے مقابلے میں' ثقافتی چیلنج کا زیادہ سامنا ہے۔ یورپی ہونے کی حیثیت سے وہ کسی حد تک عیسائی اور سیکولر طرز زندگی کے ان پہلوؤں میں شریک ہیں جن کی عکاسی معاشرے کے تعلیمی' معاشرتی' اقتصادی اور ثقافتی دائرہ اثر میں ہوتی ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ ان کے بچے ہر ممکن اعلیٰ تعلیم حاصل کریں' اپنا معیار زندگی اقتصادی ترقی میں حصہ لے کر بہتر بنائیں لیکن ساتھ ہی یہ بھی چاہتے ہیں کہ وہ اپنی گھریلو زندگی اسلام کی تعلیمات کے مطابق گزاریں۔ وہ چاہتے ہیں کہ وہ آس پاس رہنے والوں سے ملیں جلیں اور بات چیت کریں۔

تاہم جب انھیں عیسائی معاشرت کا ایک "معاشرتی حقیقت" کے طور پر احساس ہوتا ہے تو وہ یہ بھی

چاہتے ہیں کہ ان کے نظریات اور طرز زندگی کو بھی تسلیم کیا جائے اور ان کا احترام کیا جائے۔ اگر ایک فرانسیسی' جرمن یا ولندیزی عیسائی لڑکی یہ تصور کرتی ہے کہ اس کا یہ حق ہے کہ وہ سپین کے گرم ساحل سمندر پر غسل آفتابی کرے یا شہر کے معروف حصے میں hot-pants پہن کر گھومے پھرے تو ایک مقامی مسلمان لڑکی بھی یہ چاہتی ہے کہ اس کا یہ حق تسلیم کیا جائے کہ جب وہ سکول جائے یا فیکٹری میں کام کرے تو سکارف پہنے' اور اسے ایک معمول سمجھا جائے۔ اگر معاشرتی اقدار اور رسوم و رواج برہنہ کلب' عریانی و فحاشی کے مظاہروں کی اجازت دیتے ہیں تو پھر جب کچھ شہری لباس اور رہن سہن میں حیا کی روش اختیار کریں تو ان سماجی اقدار کو خطرہ محسوس نہیں کرنا چاہیے۔

ایک ایسے معاشرے میں جس نے لبرل جمہوریت کو "دیوتا" بنا رکھا ہو' مسئلہ صرف مذہبی آزادی پر عمل درآمد تک محدود نہیں ہے۔ ہمارے خیال میں مسئلہ دراصل "کثرت ثقافت" (cultural plurality) کا ہے' یعنی دوسرے افراد کو ان کی اپنی مرضی کے مطابق طرز زندگی اپنانے کی آزادی دینا۔ ایک وقت تھا جب مغرب میں یہ "ذاتی آزادی" سیکولر اور انفرادیت پسند نظام کا بنیادی ستون تصور کی جاتی تھی۔ اس قسم کے مسائل پر مناسب انداز میں مکالمہ اور گفت و شنید کرنا' ہمارے خیال میں' نہ صرف افہام و تفہیم اور ایک دوسرے کو برداشت کرنے کے کلچر کے فروغ میں مفید ثابت ہو گا بلکہ ایک نام نہاد سیکولر دنیا میں اعتدال اور توازن کا باعث بھی ہو گا۔ "کثرت ثقافت" رائج نہ ہو تو عین ممکن ہے کہ سیکولر معاشرہ "بنیاد پرست سیکولر معاشرہ" بن جائے' جہاں سیکولرازم کے ساتھ اندھی عقیدت مندی لوگوں کے لیے مقدس انجیل کی حیثیت اختیار کر جاتی ہے۔

چیلنج اور امکانات

اکیسویں صدی میں داخل ہوتے ہوئے یورپ میں مسلمانوں کو پانچ بڑے چیلنجوں کا سامنا ہے۔

تعلیمی چیلنج: ان میں پہلا چیلنج' تعلیمی چیلنج ہے۔ تعلیم' انفرادی اور اجتماعی ترقی کے لیے اعلیٰ اقدار کی منتقلی کا ایک حرکی عمل ہے۔ یہ بات کہنے کی ضرورت نہیں کہ ایک سیکولر اقدار پر مبنی نظام تعلیم الوہی اقدار سے متصف فرد تیار نہیں کر سکتا۔ اسی طرح ایک مکمل سیکولر تعلیم میں' کلاس روم میں چند گھنٹے کی "مذہبی تعلیم" یا "اخلاقی تعلیم" کا باہمی تعامل (interaction) بہ مشکل ہی یکساں سوچ کی حامل جامع شخصیت کو پروان چڑھا سکتا ہے۔ تنہا پسندی' یعنی یہ کہ دوسروں سے سماجی تعلقات کو ختم کرتے ہوئے مسلمانوں کے الگ تعلیمی ادارے قائم کر لیے جائیں' یہ بھی اس مسئلے کا حل نہیں ہے۔

اسلام نہیں چاہتا کہ اس کے ماننے والے سب سے کٹ کر زندگی گزاریں۔ وہ چاہتا ہے کہ وہ اس کی آفاقی اخلاقی اقدار میں تمام انسانیت کو شریک کریں۔

مسلم اقلیتوں کو یورپ میں' اپنے لیے اور دوسروں کے لیے ایک موثر سماجی کردار ادا کرنے کے لیے

نصابی اور ہم نصابی سرگرمیوں کا ایک مربوط نصاب تیار کرنا ہو گا۔ ۵۰ سال پرانی حکمت عملی جو مختلف مسلم آبادیوں نے بطور مسلمان اپنی بقا کے لیے اپنائی تھی' تاکہ وہ قرآن مجید کی چند چھوٹی سورتوں کی تلاوت کر سکتے ہوں' نماز پڑھ سکتے ہوں' روزہ رکھ سکتے ہوں' اور فریضہ حج کی ادائیگی کے لیے گروپ فلائٹس کا اہتمام کر سکتے ہوں' بلاشبہ نیکی کا کام ہے۔ لیکن قرآن واضح طور پر کہتا ہے:

نیکی یہ نہیں ہے کہ تم نے اپنے چہرے مشرق کی طرف کر لیے یا مغرب کی طرف' بلکہ نیکی یہ ہے کہ آدمی اللہ کو اور یوم آخر اور ملائکہ کو اور اللہ کی نازل کی ہوئی کتاب اور اس کے پیغمبروں کو دل سے مانے اور اللہ کی محبت میں اپنا دل پسند مال رشتے داروں اور یتیموں پر' مسکینوں اور مسافروں پر' مدد کے لیے ہاتھ پھیلانے والوں پر اور غلاموں کی رہائی پر خرچ کرے' نماز قائم کرے اور زکوٰۃ دے اور نیک وہ لوگ ہیں کہ جب عہد کریں تو اسے وفا کریں' اور تنگی و مصیبت کے وقت میں اور حق و باطل کی جنگ میں صبر کریں۔ یہ ہیں راست باز لوگ اور یہی لوگ متقی ہیں (البقرہ ۲: ۱۷۷)۔

اس آیت میں صاف اور واضح پیغام ہے۔ یہ عبادات کی نیکی اور عقیدے کو سماجی خدمت کے ساتھ مربوط کر کے بہترین تقویٰ قرار دیتی ہے۔ یہ واضح طور پر بتاتی ہے کہ مسلمانوں کو اگر وہ نیویارک یا برلن یا پیرس میں ہوں' محض خانہ کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرنے سے اطمینان اور مسرت نہیں ہونی چاہیے۔ انھیں' ساتھ ہی ساتھ بھوکوں کو کھانا کھلانے' حاجت مندوں کی مدد کرنے اور وہ لوگ جو سیاسی' معاشی یا ثقافتی لحاظ سے غلام ہیں' انھیں آزاد کرانے کی بھی فکر کرنی چاہیے۔

قرآن و سنت کا یہ جامع نقطۂ نظر بھی ایک مربوط نظام تعلیم کو پروان چڑھانے کے لیے بنیاد فراہم کرتا ہے جس میں مسلمان اور غیر مسلم دونوں اخلاقی تعلیم کے دائرے میں باہم اشتراک کر سکیں۔

یورپ میں مسلمانوں کی بطور اقلیت اپنی بقا کے لیے عام طور پر پائی جانے والی تشویش کو' ترک کر دینا چاہیے۔ ہمارے خیال میں ''بقا'' کی اصطلاح' ایک منفی اصطلاح ہے۔ یہ کسی معاشرے کو اخلاقی آداب اور سماجی ذمہ داریوں کی بنیاد پر تعمیر کرنے کی موثر اور مثبت اسلامی فکر کا اظہار نہیں کرتی۔

تعلیم ایک جامع تصور ہے جس میں گھر' سکول' معاشرہ اور ریاست' سب کو ایک ذمہ دارانہ اور اخلاقی کردار ادا کرنا ہوتا ہے۔ یورپ میں مسلمانوں کو ایک تعمیری اور موثر کردار ادا کرنے کے لیے غور کرنا ہو گا کہ اسلام کی آفاقی' اخلاقی تعلیمات کی بنیاد پر تعلیمی اداروں کا قیام کس طرح عمل میں لایا جائے (تفصیلی مطالعے کے لیے ملاحظہ کیجیے: خرم مراد' "Muslim Youth in The West" اسلامک فاؤنڈیشن' لیسٹر' برطانیہ' اشاعت ۱۹۸۶ اور انیس احمد' Value Centric Education System' اسلام آباد' ۱۹۹۶)۔

اسلام کی آفاقی اخلاقی تعلیمات اور آداب مسلمانوں اور غیر مسلم دونوں کے لیے ہیں اور نتیجتاً مسلمانوں اور دوسروں کے درمیان باہمی اشتراک اور افہام و تفہیم کے لیے ایک فطری بنیاد فراہم کرتے

ہیں۔

ذرائع ابلاغ کا چیلنج : دوسرا بڑا چیلنج جس کا یورپ میں مسلمانوں کو سامنا ہے' جو اگرچہ صرف انھی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے' ذرائع ابلاغ سے متعلق ہے۔ ذرائع ابلاغ کی ٹکنالوجی میں انقلاب نے براہ راست ہمارے علم' عدل' حسن' انسانیت اور معقولیت کے تصورات کو متاثر کیا ہے۔ جو کچھ ہم اور ہمارے بچے ٹیلی ویژن کی سکرین یا عالمی پیمانے پر وابستہ کمپیوٹر نیٹ ورک پر دیکھتے یا سیکھتے ہیں' وہ ہمارے لیے تعین کرتا ہے کہ کیا حقیقت ہے' کیا سچ ہے یا کیا صحیح ہے اور کیا غلط ہے۔ یا تو ناظرین کو میڈیا کے کنٹرول کے آگے ہتھیار ڈالنا ہوں گے یا پھر انھیں ایک تعمیری سوچ کو پروان چڑھانا اور معلومات اور علم کا وہ تصور دینا ہو گا جس میں اقدار کو مرکزی مقام حاصل ہو۔

یہ بات محتاج بیان نہیں کہ اسلام کا اخلاقی نظام کسی خاص دائرے تک محدود نہیں ہے۔ جس طرح اسلام عالم گیر ہے' اسی طرح اس کی اقدار تمام انسانیت سے متعلق ہیں۔ مذہب میں اختلاف کے حق کو تسلیم کرتے ہوئے' اسلام اس بات پر زور دیتا ہے کہ جان' عزت و آبرو' استدلال اور ملکیت کے حق سے متعلق معاملات میں انسانوں کے درمیان امتیاز روا نہیں رکھنا چاہیے۔ زندگی' استدلال' عزت' مذہبی آزادی اور ملکیت کا حق جنس' رنگ' نسل اور کسی عصبیت کی تمیز سے بالاتر ہو کر ہر ایک کو حاصل ہونا چاہیے۔

جب ان قدروں کو تعلیم اور ذرائع ابلاغ کی بنیاد کی حیثیت سے لیا جائے گا تو اس کے نتیجے میں اخلاقی طور پر ذمہ دار معاشرہ وجود میں آئے گا۔ جب ان آفاقی اقدار کو رد کیا جائے گا اور جائز مقام نہیں دیا جائے گا تو اس کے نتیجے میں نفسا نفسی' انتہا پسندی اور ایک دوسرے کو برداشت نہ کرنے والا معاشرہ وجود میں آئے گا۔ مسلمانوں کو یورپ اور مغرب میں اس چیلنج کا سامنا کرنا ہو گا' اپنی بقا کے لیے نہیں بلکہ ایک صحیح معنوں میں ہوش مند (sane)' منصفانہ اور اصولوں پر مبنی انسانی معاشرے کی تشکیل کے لیے۔

خاندان اور مرد و زن کے تعلق کا چیلنج : تیسرا بڑا چیلنج جس کا مسلمانوں کو مغرب میں سامنا ہے وہ خاندان کا جدید تصور اور مرد و زن کا باہمی تعلق ہے۔ ایک معروف امریکی مسلم دانش ور پروفیسر اسماعیل الفاروقی (۱۹۲۱-۱۹۸۶) نے بجا طور پر نشان دہی کی ہے کہ "اسلامی گھرانہ' اگر یہ صحیح معنوں میں اسلامی ہے' وہ صحیح آئیڈیل ہے جس کی اہل مغرب آج آرزو کرتے ہیں" (The Path of Dawah in the West' یو کے اسلامک مشن' لندن' ۱۹۸۶)۔ انسانیت کے نام اسلام کے پیغام کی ایسے مسلم گھرانے سے اچھی کوئی شکل نہیں جہاں اسلام پر عمل کیا جاتا ہو۔ ایک ایسی دنیا میں جہاں عیسائی چرچ نے ہم جنس پرستوں کی شادی جائز کر دی ہو' جہاں ایک غیر اخلاقی جنسی انقلاب برپا ہو چکا ہو' جہاں جدید دور کی جنسی اخلاقیات نے قانونی طور پر جائز شادی کو جو میاں اور بیوی کے درمیان اخلاقی اور قانونی معاہدہ ہوتا ہے' اسے کمزور کر دیا ہے اور اس کی خوب تحقیر کی ہے جب کہ ایڈز جیسی مہلک بیماری کی لعنت نہ صرف ان لوگوں کو جو غیر اخلاقی

افعال کرتے ہیں بلکہ ان معصوم جانوں کو بھی جو اس مرض کی اذیت کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں' شکار کر رہی ہے۔ ان حالات میں مسلمانوں کے لیے اشد ضروری ہے کہ وہ دوسروں کو دیکھنے اور خود تجربہ کرنے کا موقع دیں کہ اخلاقی اصولوں پر مبنی خاندانی زندگی سے کس طرح ایک ایڈز سے پاک' دوستانہ معاشرہ اور ماحول وجود میں آتا ہے۔ اگر مسلم نوجوان جرمنی' برطانیہ' فرانس اور جہاں کہیں بھی ہوں' یونی ورسٹیوں میں اپنی تعلیم کے دوران لڑکیوں سے دوستی لگانے (dating) اور شادی سے قبل جنسی تعلقات قائم کرنے سے باز رہیں تو کیوں ممکن نہیں ہے کہ دوسرے لوگ ایک ایسا معاشرہ جس میں عظمت اور عزت سب کے لیے ہو' تعمیر کرنے میں ساتھ نہ دیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مغربی دنیا میں مسلمانوں کا وجود اور صرف مسلم خاندانی نظام کی تشکیل ہی سماجی اور خاندانی بحرانوں کے حل کے لیے جو کہ سیکولر ثقافتی معاشروں میں مکمل طور پر چھا چکے ہیں' مددگار ہو سکتے ہیں۔

اسلام کی معاشی تعلیمات کا اطلاق: چوتھا چیلنج جو کہ کسی بھی طور پر کم اہم چیلنج نہیں ہے جس کا مغرب میں مسلمانوں کو سامنا ہے' اسلام کی معاشی تعلیمات کے اطلاق سے متعلق ہے۔ اسلام ایک جامع تصور حیات کی حیثیت سے انسان کو درپیش اقتصادی مسائل کا قابل عمل حل پیش کرتا ہے۔ ایک غالب مسلم ریاست کے تناظر میں' اور اس کے ساتھ ساتھ ایسی حالت میں جب مسلمانوں کا معاشی اور سیاسی اداروں میں مکمل طور پر کنٹرول نہ ہو' اقتصادیات' کامرس اور تجارت سے متعلق اسلام کے تصور میں ایک غیر معمولی بڑی غلط فہمی پائی جاتی ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اسلام کے اقتصادی اصولوں کی تشکیل صرف ایک آئیڈیل اسلامی ریاست میں ہی ہو سکتی ہے۔ درحقیقت ایک مکمل اور جامع تبدیلی جیسا کہ اسلام کا تصور ہے' ہر شعبہ زندگی میں اسلامی نظام پر عمل درآمد کے لیے سہولت دیتی ہے۔ لیکن اسلام ایسی صورت حال کے لیے بھی نمونہ پیش کرتا ہے جہاں اسلام غالب نہیں ہے جیسا کہ مکہ میں ہوا' جہاں اسلام کی دعوت کے ابتدائی ۱۳ سال میں اسلام غالب نہ تھا۔

اگرچہ قرآن کے بیشتر سماجی' اقتصادی اور سیاسی احکامات مدینہ منورہ میں نازل ہوئے تھے' مگر مکی دور میں بھی رسول کریمؐ نے ایسے تمام لین دین سے احتراز کیا تھا جو بعد میں قرآن کے ذریعے حرام قرار دے دیے گئے۔ سیکولر مکہ میں جب وہ مکمل طور پر تجارت اور سماجی سرگرمیوں میں مشغول تھے تو ان کا اخلاقی کردار اتنا واضح تھا کہ اہل مکہ انھیں سب سے زیادہ قابل اعتماد اور سچا شخص پکارتے تھے' جب کہ ان کی مکہ میں موجودگی کو اپنے مروجہ نظام کے لیے ایک خطرہ تصور کرتے تھے۔ ان معاملات میں بہترین اخلاق ہی تھا کہ دشمنوں نے بھی انھیں "الامین" کے لقب سے پکارا۔ یہ بات محتاج بیان نہیں کہ رسول کریمؐ اور آپؐ کے صحابہؓ کا بہترین کردار مکہ میں اسلامی تحریک کی حقیقی طاقت بن گیا۔ اگرچہ وہ تعداد میں تھوڑے تھے لیکن یہ ان کے اخلاقی برتری اور بلندی کردار کا نتیجہ تھا کہ مسلمان مکہ میں ایک اخلاقی قوت بن گئے۔

مسلمانوں کو یورپ میں' اور کہیں بھی' جلد یا بدیر معاشی ترقی میں حصہ لینے جیسی تعمیری سوچ کے ساتھ معاشی چیلنج کا سامنا کرنا ہو گا۔ انھیں ایک نئی صلح حدیبیہ پر عمل درآمد کرنا ہو گا جس میں استحصال پر مبنی عالمی سودی معیشت سے کوئی سمجھوتہ کیے بغیر' وہ اپنی تجارت اور کامرس میں وہ کاروباری اصول اور کردار جو کہ اسلام کی حرام و حلال کی تعلیمات کے مطابق ہوں' متعارف کروائیں۔ انھیں اپنی معاشی اساس' صاف ستھرے اور سود سے پاک معاشی ترقی کے تصور پر قائم کرنا ہو گی۔ اسلام کے اصول مضاربہ (project finance or venture capital) مشارکہ (اشتراک کاروبار) اور مرابحہ (cost plus بنیادوں پر سرمایہ کاری) مسلم اکثریت سے یا اس سے ہٹ کر کاروباری معاملات کے لیے مناسب ہیں۔ اسلام میں زکوٰۃ کے ذریعے غریب اور حاجت مندوں کے لیے معاشی کفالت کے انتظام کے تصور کا اطلاق بھی عالمی سطح پر ہوتا ہے۔ مغرب میں مقیم مسلمان یہ سمجھنے میں غلطی پر ہوں گے کہ زکوٰۃ کی بنیاد پر معیشت صرف اسلامی ریاست سے متعلق اور مخصوص ہے۔ بلاشبہ زکوٰۃ سے مکمل طور پر استفادے کے لیے یہ ناگزیر ہے کہ ایک اسلامی ریاست قائم کی جائے اور حکومت کی ذمہ داری ہو کہ وہ زکوٰۃ جمع کرے اور تقسیم کرے (الحج ۲۲:۴۱)۔ لیکن زکوٰۃ پانچ وقت کی نماز کی طرح ایک فریضہ ہے۔ چنانچہ جگہ اور وقت کی تبدیلی ایک مسلمان کی زندگی میں اس کی اہمیت اور اطلاق کو بدل نہیں سکتی خواہ وہ فرینکفرٹ' قرطبہ یا اسلام آباد میں رہتا ہو۔

زکوٰۃ بحیثیت عبادت بھی منصفانہ سماجی ترقی کا ایک ذریعہ ہے۔ یہ ایک مسلمان مرد اور عورت کو مال و دولت کی محبت سے آزاد رکھنے میں مدد دیتی ہے۔ یہ ایک فرد کو دولت میں دوسروں کو شریک کرنے کی تربیت کرتی ہے اور شعور بخشتی ہے اور دوسروں کو معاشی استحکام دینے اور مفلسی سے بچانے میں مددگار ہوتی ہے۔ فطری طور پر اسلام کی ایسی بنیادی تعلیم کو ایک مسلم آبادی کے سیاسی اقتدار کے حصول تک کے لیے موخر نہیں کیا جا سکتا۔ مسلم آبادی کے لیے یہ ایک قابل غور مسئلہ ہے کہ ایک غیر مسلم ریاست اور معاشرے میں زکوٰۃ کے نظام پر محدود سطح پر کیسے عمل درآمد کیا جائے؟ اس کے عمل درآمد اور نظم و انصرام کے لیے درحقیقت ایک نئی بدلی ہوئی صورت حال میں منصوبہ عمل بنانا ہو گا۔

مخلوط ثقافت کا چیلنج: پانچواں بڑا چیلنج جس کا مسلم آبادیوں کو مغرب میں سامنا ہے لازمی طور پر نتیجہ ہے ثقافتی اثرات کا جو تارکین وطن اپنے آبائی ممالک سے ساتھ لائے ہیں۔ فقہ اور اسلامی قانون کے اطلاق میں اختلاف بعض اوقات مسلم آبادیوں میں تقسیم کا باعث بن جاتا ہے۔ ہماری رائے میں مسلم آبادیوں میں باہمی تعامل' ان اختلافات کو کم کر رہا ہے۔ ہماری خوش گمانی کی ایک بڑی وجہ مسلم نوجوانوں' مردوں اور خواتین میں اپنے آپ کو براہ راست قرآن اور سنت رسولؐ اللہ سے وابستہ کرنے کا بڑھتا ہوا رجحان ہے۔ علوم کے ان بنیادی مآخذ سے براہ راست استفادہ ایک مومن کو اس بات کو سمجھنے میں مدد دیتا

ہے کہ قرآن و حدیث کے ایک مفہوم اور توجیہہ کو کسی دوسرے پر کیوں فوقیت دی گئی ہے۔ نتیجے کے طور پر یہ اسلامی قانون کے اطلاق کے لیے مختلف معنی اور توجیہات کو برداشت کرنے کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔

اس سمت میں فطری ارتقا کے نتیجے میں یہ آبادیاں اسلامی مآخذ کو اپنے مخصوص تناظر اور حالات میں منطبق کرنے لگیں گی اور غالباً اپنی فقہ کی تدوین کر سکیں گی۔ یہی وہ عمل ہے جس کے نتیجے میں اسلام کی ابتدائی تین صدیوں میں پانچ بڑے فقہی مکاتب فکر کا ارتقا ہوا (ہماری مراد حنفیہ، جعفریہ، مالکیہ، شافعیہ اور حنبلیہ فقہی مکتب فکر ہیں)۔ ان پانچوں فقہی توجیہات کو علما کی طرف سے نافذ العمل تسلیم کیا گیا۔ اگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ایک چھٹی فقہی توجیہ سامنے آجاتی ہے تو یہ فطری عمل سے انحراف نہ ہوگا۔

مغرب میں مسلم آبادیاں، ہمارے خیال میں صرف اسی صورت میں ایک موثر اور تعمیری کردار ادا کر سکتی ہیں جب وہ اپنے آپ کو اپنے ہی پر مرکوز (self-centred) نقطۂ نظر سے آزاد کر کے سماجی تعمیرنو کے نقطۂ نظر کو اپنائیں۔ اسلام نہ صرف مسلمانوں کو بلکہ دوسروں کو بھی امن، سماجی انصاف اور تحفظ کی پیش کش کرتا ہے۔ مسلم آبادیاں عام طور پر اپنے آپ کو "اقلیت" تصور کرتی ہیں اور اکثریت کی طرف مفادات، مراعات اور حقوق کے لیے دیکھتی ہیں، جب کہ قرآن مسلمانوں کو امت وسط (البقرہ ۲: ۱۴۳) قرار دیتا ہے اور مسلمانوں کو ذمہ دار ٹھیراتا ہے کہ وہ دوسروں تک پہنچ کر اور ان کے سماجی، معاشی اور دیگر مسائل کو حل کر کے معاشرے میں اقدار کی تبدیلی کے ذریعے سماجی تبدیلی لائیں۔ اس لحاظ سے مسلمان خاص نوعیت کی امت ہیں، انسانوں کا ایک ایسا گروہ جن کی کچھ آفاقی، اخلاقی اصولوں سے وابستگی ہے، ان اصولوں کا معاشرے میں نفاذ، ان کی بقا کا اہم مقصد اور غرض ہے۔ لہٰذا مغرب میں مسلمانوں کو یہ سوچنا چاہیے کہ وہ خود ایک سماجی طور پر ذمہ دار معاشرے کے قیام کے ذریعے دوسروں کی فلاح و بہبود کے لیے کیا کردار ادا کر سکتے ہیں۔

مغرب میں مسلمانوں کی آبادی میں نمایاں اضافہ اس بات کا مطالبہ کرتا ہے کہ مسلم آبادی کی نفسیات میں ایسی تبدیلی آنی چاہیے کہ وہ اپنے گردونواح میں عوام کی سطح پر سماجی، معاشی اور تعلیمی معیار کو بلند کرنے کے لیے اپنا اخلاقی کردار ادا کر سکیں۔ باہر کی دنیا کو دیکھنے والا، حرکی اور اخلاقی نقطۂ نظر مسلمانوں اور دوسروں کے درمیان رابطے کا پل تعمیر کر سکے گا اور مسلمانوں اور اسلام سے متعلق لاکھوں کم باخبر افراد کے درمیان پائی جانے والی اسلام سے متعلق غلط فہمی کو دور کر سکے گا (ترجمہ: امجد عباسی)۔